جنت اور جہنم کا قیام

قران مجید کی سورہ فرقان میں جہنم کے متعلق آیت 66 میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ وہ بدترین مستقر اور مقام ہے۔ یہی بات آیت 76 میں جنت کے متعلق کہی گئی ہے کہ وہ بہترین مستقر اور مقام ہے۔ بظاہر دونوں الفاظ ہم معنی ہیں لیکن صاحب تدبر قرآن امین احسن اصلاحی نے ان دونوں الفاظ کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ یہ دونوں الفاظ جب ایک ساتھ آتے ہیں تو مستقر سے مراد مستقل اور مقام سے مراد عارضی قیام گاہ کے ہوتے ہیں، (تدبر قرآن 487/5)۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم تو ہیں ہی مستقل قیام کی جگہیں، وہاں کے عارضی قیام سے کیا مراد ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ جنت اور جہنم بے شک ابدی قیام کی جگہیں ہیں، لیکن دونوں کے اندر بہت مختلف جگہیں ہوں گی جن میں انسان عارضی طور پر رہا کریں گے۔ چنانچہ اہل جہنم کبھی آگ میں ہوں گے، کبھی ان کو خاردار جھاڑیاں چرنے کے لیے لے جایا جائے گا۔ کبھی کھولتے ہوئے پانی کے چشمے سے سیراب کرنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔

اسی طرح اہل جنت کبھی اپنے گھروں میں ہوں گے، کبھی سیر گاہوں میں، کبھی بستروں پر اور کبھی دوست احباب کی محفلوں میں۔ ان میں سے ہر جگہ ان کا قیام عارضی ہوگا۔ قرآن مجید یہ بتارہا ہے کہ جنت میں مستقل رہنے کا احساس بھی شاندار ہوگا اور ہر مقام پر عارضی قیام کے دوران بھی وہ بہترین نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ یہی معاملہ جہنم کا ہے کہ اس کا مستقل قیام ہر لمحہ ایک اذیت لے کر آرہا ہوگا اور اس جہنم میں جب ایک جگہ سے دوسری جگہ وہ منتقل کیے جائیں گے تو ہر جگہ ہی بدترین محسوس ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ نعمت ہو یا عذاب، اگر مستقل ایک جیسی ہو جائیں تو اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ لیکن قرآن کے اس مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اتنا تنوع ہوگا کہ جنت کا ہر مقام بہت اچھا اور جہنم کا بہت برا لگے گا اور یہی احساس جنت کو جنت اور جہنم کو جہنم بنائے رکھے گا۔ اہل جنت اپنی نعمتوں سے کبھی بور نہ ہوں گے اور اہل جہنم کبھی عذاب کے عادی نہ ہوسکیں گے۔

اسباب اور شرک

خدا کی دنیا ایک انتہائی خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں رنگ ہے، نور ہے، روشنی ہے، خوشبو ہے، جلوے ہیں، ذائقے ہیں اور زندگی ہے اور زندگی کو ممکن، آسان، پرلطف بنانے کے ہزارہا سامان ہیں۔ یہ سب ایک ہی ہستی کے فیض کا ظہور ہے۔ اللہ رب العالمین۔

عجیب بات ہے کہ لوگوں کی اکثریت ہمیشہ دوسرے انسانوں کے فیض کا ذکر کرتی چلی آئی ہے۔ انھی کو ہر نفع وضرر کا مالک مانتی آئی ہے۔ اکثر لوگ انھی کے در پر جا کر نذر پیش کرتے اور انھی کی شکرگزاری کو اپنی عقیدت کا مرکز بناتے ہیں۔

یہ رویہ غلط ہے۔ ہر پہلو سے غلط ہے۔ ہر سطح پر غلط ہے۔ انسان اسباب سے بلند ہو کر دوسرے انسان کو کچھ نہیں دے سکتا۔ انسان اسباب کے دائرے میں رہ کر ہی دوسرے انسان کے لیے کچھ کرسکتا ہے۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو پالتے ہیں۔ استاد طلباء کو علم دیتا ہے۔ اچھے حکمران عوام کو سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ ایسے سب لوگ بلاشبہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔ ان کا احسان مانا جائے۔

تاہم یہ صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہستی ہے جو اسباب سے بلند ہو کر دوسروں کو سب کچھ عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر مریض کا علاج کرسکتا ہے۔ شفا صرف اللہ دیتا ہے۔ وہ نہ دینا چاہے تو ساری دنیا کے ڈاکٹر مرض دور نہیں کرسکتے۔ وہ شفا دینا چاہے تو مریض بغیر دوا کے ٹھیک ہو جاتا ہے۔

یہی باریک فرق ہے جو نہ سمجھا جائے تو انسانوں کو شرک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لوگ انسانوں سے بے جا توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ مفاد پرست لیڈر مرنے والوں کے نام پر اپنی بڑی بڑی دکانیں بنالیتے ہیں۔ عوام توہمات کی دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ خدا اسباب سے بلند ہے۔ انسان اسباب کا پابند ہے۔ خدا اسباب تخلیق کرتا ہے اور انسان ان کو استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے خدا خدا ہے۔ اسی لیے انسان انسان ہے۔

اسباب اور الحاد

خدا کی دنیا اٹل قوانین پر چل رہی ہے۔ ہمیشہ سے چلتی رہی ہے۔ مگر پچھلے زمانے میں لوگ اسے دیوتاؤں اور بزرگوں کی کرشمہ سازی قرار دیتے رہے تھے۔ کوئی بارش کا دیوتا تھا تو کوئی روزی کا۔ کسی بزرگ کے ہاں سے اولاد ملتی تھی تو کوئی زندگی و موت کا مالک تھا۔ کسی کا فیض رزق بڑھاتا تھا تو کسی کی مدد ہر مشکل سے انسان کو نکال دیتی تھی۔

جدید سائنس نے آ کر ان سارے توہمات کا خاتمہ کر دیا۔ دنیا جن اصول وقوانین پر چل رہی ہے ان میں سے بیشتر معلوم ہو چکے ہیں۔ جتنا زیادہ سائنسی علم ترقی کر رہا ہے اتنا ہی انسان دنیا کے اسباب وقوانین کو سمجھ کر ان کو اپنے فائدے میں استعمال کر رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال میڈیکل سائنس کی ترقی ہے جس نے نجانے کتنی لاعلاج بیماریوں کا خاتمہ کر کے انسانی زندگی کو سکون اور آسانی سے بھر دیا ہے۔

مگر اس صورتحال کا ایک دوسرا نتیجہ بھی نکلا ہے۔ آج لوگ اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ جس طرح قدیم انسان مخلوق کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ جدید انسان مخلوق کی ایک دوسری قسم یعنی اسباب کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اسباب ہمیشہ فیض بخش نہیں ہوتے۔ تباہی بھی اسباب کے ہاتھوں آتی ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر سارے اسباب مل کر اس دنیا میں زندگی کا فیض جاری کر رہے ہیں۔ سورج حرارت دیتا ہے، مگر وہ کون ہے جس نے اسے زمین سے اتنا دور کر رکھا ہے کہ اس کی آگ زندگی بنی ہوئی ہے، موت نہیں۔ ہوا سانس لینے کا ذریعہ ہے، مگر کون ہے جو اس میں صرف اتنی آکسیجن رکھے ہوئے ہے جو زندگی بخش ہے۔

یہی ہستی خدا کی ہستی ہے۔ وہ اسباب کا خالق ہے۔ اسی کا فیض ہے کہ اسباب نفع بخش ہیں۔ یہی خدا کے ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

فکری مباحث اور تیسرا فریق

پاکستان میں اس وقت بعض فکری مباحث پوری قوت کے ساتھ اٹھ چکے ہیں۔ ہمارے جیسے طالب علموں کے لیے جن کی زندگی فکری دریافت اور تحقیق کے عمل مسلسل سے گزری ہے، جہاں ہر قدم پر اپنے بنائے ہوئے بتوں کو توڑنا پڑتا ہے، اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ تاہم یہ ''بت شکنی'' کوئی آسان کام نہیں۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے جن کی ساری زندگی صرف اپنا نقطہ نظر سنتے ہوئے اور اسے ہی واحد حق سمجھ کر گزرتی ہے۔ ان کے لیے یہ صورتحال بہت وحشتناک ہوتی ہے۔

ایسے میں یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہر دو طرف کے لوگوں کو کہ دونوں ہی مسلمان اور مخلص ہیں، یہ یاددہانی کرادی جائے کہ قرآن مجید کے مطابق نبوت کے بعد بلند ترین مقام صدیقین کا ہوتا ہے۔ یہ مقام اپنے تعصّبات سے بلند ہو کر سچائی کو قبول کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مناظرانہ سوچ کے ان لوگوں کو یہ مقام کبھی نہیں ملتا جن کا مقصد صرف اپنی بات کو سچا ثابت کرنا ہوتا ہے۔

مومن اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے بجائے سچائی کو حاصل کرنے اور اس کی تصدیق کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بات سمجھانے کی خواہش تو یقیناً رکھتا ہے، مگر دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ بارہا وہ اپنی بات کہنے جاتا ہے، مگر دوسرے کی سن کر آجاتا ہے۔ وہ اپنے نقطہ نظر کے دلائل رکھتا ہے، مگر ان کی کمزوری واضح ہوتے ہی اپنے نقطہ نظر کو چھوڑ کر دوسرے کی سچائی کا اعتراف کر لیتا ہے۔

مومن کے اس رویے کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ ایسے فکری مباحث میں تیسرا فریق خود پروردگار عالم ہوتا ہے۔ اور اگر رب کو راضی کرنا ہے اور اس سے صدیقیت کا پروانہ لینا ہے تو پھر انانیت، تعصب اور ہٹ دھری کوئی راستہ نہیں ہے۔ جس نے یہ بات سمجھ لی وہی آج کے دور کا صدیق ہے۔ وہی جنت کے اعلیٰ ترین درجات کا حقدار ہے۔

اہل مذہب کا کٹا ہوا ہاتھ

اہل پاکستان عمومی طور پر مذہب سے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔عملی طور پر ان کی زندگیاں اسلام سے کتنا ہی دور ہوں، مگر اللہ اوراس کے رسول کی محبت اور اسلام سے گہری وابستگی اس خطے کے لوگوں کے قومی مزاج کا حصہ ہے۔

دیگر وجوہات کے علاوہ یہ بھی ایک اہم سبب تھا جس کی بنا پر تحریک پاکستان میں مذہب کے نعرہ کو قبولیت ملی۔گرچہ یہ بات معلوم ہے کہ مسلمانوں کی جس لیڈرشپ اور اشرافیہ نے اصلاً حصول پاکستان کی جدوجہد کی اور جو ان کے بعد اقتدار کے منصب پر فائز ہوئی، اس کا آج کے مروجہ معنوں میں مذہب سے عملی تعلق نہیں تھا۔ یہ حقیقت نہ صرف اُس دور کے سماجی حالات سے عیاں ہے بلکہ ان سوانح عمریوں سے بھی جھلکتی ہے جو صف اول و دوم کے لوگوں کے حوالے سے لکھی گئیں۔اس حقیقت کو مزید سمجھنا ہو تو اس تنقید کو پڑھنا چاہیے جو مسلم اشرافیہ اور لیڈرشپ کو مغرب پرست اوران کی زندگی کو مغربیت کا نمونہ ثابت کرنے کے لیے اُس دور میں اسلام پسند لیڈرشپ نے لکھی۔

اُس دور میں اسلام پسندوں کی طاقت بہت کم ، لیکن ان کا اخلاقی اور فکری مقدمہ مضبوط تھا۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ آپ کا فکری اور اخلاقی مقدمہ مضبوط ہو تو وقت کے ساتھ آپ طاقتور ہوتے چلے جاتے ہیں۔یہی پاکستان میں ہوا۔ابتدائی تین عشروں کے بعد صورتحال بدلنا شروع ہوئی۔مغرب پسندی یا لبرل سوچ کو شکست ہونا شروع ہوئی۔پھر بعض ملکی اور بین الاقوامی حالات نے ستر کی دہائی کے آخر میں صورتحال کو ایک دم سے اہل مذہب کے حق میں تبدیل کردیا۔ بظاہر یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔مگر دراصل یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا۔اس نازک امتحان کو بیسویں صدی کے عظیم اسلامی مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے محسوس کرتے ہوئے پاکستان

کے اسلام پسندوں کو بتادیا تھا کہ آپ کے ترکش میں ایک ہی تیر ہے۔ اسے چلانے کا وقت آ گیا ہے۔ اگر نشانہ خطا ہوگیا تو پھر آپ کے پاس چلانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا۔

ان کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل آپ دوسروں پر تنقید کرکے اور نفاذ اسلام کے ساتھ ہی فلاح و برکات کے ظہور کے جو دعوے کر چکے ہیں، وہ کسی بھی وجہ سے ظاہر نہیں ہوئے تو لوگوں کا اسلام پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔ بدقسمتی سے مولانا کا اندیشہ سو فی صد درست ثابت ہوا۔ تاہم بات صرف اتنی ہی رہتی تو صورتحال کو سنبھالا جاسکتا تھا۔ یہ کہا جاسکتا تھا اور کہا گیا کہ نفاذ اسلام کے عمل میں اخلاص نہ تھا، طریقہ کار درست نہ تھا وغیرہ وغیرہ۔ اسی اور نوے کی دہائی میں یہی عذر پیش کیے جاتے رہے۔ اس کے بعد اسلام پسندی کے بطن سے انتہا پسندی، فرقہ وارانہ قتل و غارتگری اور دہشت گردوں کا ناسور برآمد ہوا۔ اس کی بھی کسی نہ کسی طرح تاویل کر لی جاتی، مگر اہل مذہب کے وہ گروہ جو اصلاً مغرب پسند لبرل سوچ کے خلاف پیش پیش تھے، انھوں نے اس موقع پر انتہائی بھیانک غلطی کا ارتکاب کیا۔

ان اسلام پسندوں نے بظاہر دہشت گردی کی مذمت کی، مگر ہر ہر پہلو سے اور ہر ہر فورم پر عملاً دہشت گردی اور انتہا پسندی کی بھرپور تائید کی۔ یہ کرنے کے بعد اہل مذہب نے اپنی اصل طاقت یعنی فکری اور اخلاقی برتری کو کھودیا۔ جس کے ساتھ ہی پاکستان میں لبرل اور سیکولر نقطہ نظر رکھنے والوں کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ اس نقطہ نظر کو مزید طاقت ان مقبول عام دانشوروں نے عطا کردی جو نظری طور پر لبرل تو نہیں مگر عملی طور پر وہ پاکستان کو طالبان کے افغانستان کے مقابلے میں طیب اردگان کے ترکی جیسا دیکھنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو فکری معرکہ بظاہر اسی کی دہائی میں ختم ہوگیا تھا وہ ایک دفعہ پھر شروع ہوچکا ہے۔ اس معرکے میں اہل مذہب فکری طور پر تو کمزور ہو ہی چکے ہیں کہ

اب ان کے پاس مولانا مودودی کا قلم ہے نہ امین احسن اصلاحی کا علم، ابوالحسن علی ندوی کی فکر ہے نہ شبیر احمد عثمانی کا پس منظر۔ کسی فکری معرکے میں جذباتی لکھاری اور انتہا پسندانہ سوچ رکھنے والے مقررین کی حیثیت ٹینکوں کے مقابلے میں تلواروں سے لڑنے والوں کی ہوتی ہے۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہوں، تب بھی ٹینکوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔

تاہم اس فکری کمزوری سے کہیں بڑھ کر سانحہ اہل مذہب کے ساتھ یہ ہوا کہ وہ اخلاقی طور پر ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور ہو رہے ہیں۔ ہر دفعہ جب اس ملک میں یا دنیا بھر میں کہیں ان ہی کی فکر رکھنے والے گروہ کوئی خودکش حملہ کرتے ہیں۔ یا پھر توہین رسالت کے شبہہ میں کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ یا فرقہ وارانہ قتل کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے یا اقلیتی گروہ کے کسی فرد یا بستی کو نشانہ بنایا جاتا ہے یا پھر جیسا کہ اب نیا رجحان سامنے آیا ہے کہ پندرہ برس کا نوجوان اپنی ہی نادانستہ توہین رسالت کے جرم میں اپنا ہی ہاتھ کاٹ لیتا ہے؛ ہر ایسے واقعے کے ساتھ اہل مذہب کا اخلاقی مقدمہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں جب بھی فکری معرکے بپا ہوتے ہیں تو ان کے نتائج برسوں میں نہیں عشروں میں نکلتے ہیں۔ اگر حالات کا دھارا اسی سمت میں بہتا رہے گا، اہل مذہب اپنی نمائندگی کے لیے انتہا پسند اور جذباتی لوگوں کا ہی انتخاب کریں گے۔ اگر انتہا پسندی اور دہشت گردی کے واقعات ایسے ہی رونما ہوتے رہیں گے اور اہل مذہب اسلام کے نام پر اس انتہا پسندی کے خلاف اعلان جنگ نہیں کریں گے تو یہ طے ہے کہ آنے والے عشروں میں پاکستان میں لبرل سیکولر سوچ کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا جتنا آج تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسلام پسند شاید اس حقیقت سے نادانستہ آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں کہ بیس کروڑ کے اس ملک میں وہ آج کے دن تک ایک اقلیت ہیں۔ مذہب کی محبت اپنی جگہ، اہل پاکستان بہرحال

انتہا پسند نہیں ہیں۔ مغربی تہذیب ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہر گھر میں داخل ہو کر مغربی لبرل سوچ کا دروازہ کھول رہی ہے۔ لوگ فکری اور عملی اثرات قبول کر رہے ہیں۔ موجودہ نسل میں ان اثرات کو پوری طرح نہیں دیکھا جا سکتا، یہ اگلی نسل ہی ہوگی جو بالکل ایک مختلف منظر پیش کرے گی۔ پاکستان اگلے عشروں میں وہ نہیں رہے گا جو ماضی میں تھا یا جو اب ہے۔ تاہم یہ پاکستان کیسا ہوگا، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آج مذہبی لوگ اپنی رہنمائی کے لیے کس قسم کی صدا کو قبول کرتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ مروجہ مذہبی سوچ اس نوجوان کی طرح اپنے ہاتھ کٹوا چکی ہے۔ اہل مذہب اپنے کٹے ہوئے ہاتھ سے اس دروازے کو بند نہیں کر سکتے جو مغربی تہذیب ہمارے ہر گھر میں آنے والے برسوں میں کھولنے جا رہی ہے۔

مذہب اور ریاست

دور جدید میں مغربی افکار کے عروج سے قبل انسانی معاشرے عام طور پر مذہبی ہوا کرتے تھے جن پر اہل مذہب کی گہری گرفت ہوتی۔ چنانچہ اہل اقتدار کی ہر دور میں یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اہل مذہب سے بنا کر رکھی جائے یا پھر خود ہی مذہبی تقدس حاصل کرلیا جائے۔ حکمرانوں کے مذہبی تقدس حاصل کرنے کی ایک قدیم مثال فراعین کا مصر تھا جس میں بادشاہوں کو خدا کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ اہل مذہب کی طاقت کو قبول کر کے ان سے بنا کر رکھنے کی مثال از منہ وسطیٰ کا یورپ تھا جس میں پوپ کو غیر معمولی قوت حاصل تھی۔

مذہب اور ریاست کے اس گٹھ جوڑ کا ایک نتیجہ مذہبی جبر کی صورت میں نکلتا۔ زمانہ قدیم میں ہزاروں برس تک یہی وہ صورتحال تھی جس میں شرک کو ریاستی سرپرستی حاصل رہی اور انبیائے کرام کے پیروکاروں کو توحید قبول کرنے کی پاداش میں زبردست ریاستی جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ انبیا و رسل نے ہمیشہ اس مذہبی جبر کے خلاف جنگ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کا حکم یہی تھا کہ مشرکین کے اس جبر یا فتنہ کے خلاف جنگ کر کے اسے ختم کر دیں۔

مغرب کو اس مذہبی جبر سے ذرا دیر سے نجات ملی۔ مگر جب ان کو نجات ملی تو انھوں نے مذہب ہی سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ چھٹکارا ان معنوں میں نہیں تھا کہ فرد کی زندگی سے اسے نکال دیا جائے، بلکہ اس معنی میں تھا کہ ریاست کے معاملات میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اگرچہ کمیونزم کی شکل میں جبر کی ایک دوسری شکل بھی جدید دنیا میں نمودار ہوئی جو اپنی نوعیت میں مذہب مخالف تھی۔ تاہم دنیا میں عمومی طور پر مغربی سیکولرازم ہی کو قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور یہی اب جدید دنیا میں حکمرانی کا بنیادی ضابطہ مان لیا گیا ہے کہ ریاست اپنے باشندوں کے مذہب کے بارے میں غیر جانبدار ہوگی۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے ہاں ریاست اور مذہب کے تعلق کے حوالے سے ایک بحث جاری ہے۔ حالیہ برسوں میں دہشت گردی اور اقلیتوں کے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات کی بنا پر ایک دفعہ پھر یہ بحث تازہ ہوگئی ہے۔ سیکولرازم کے موئدین قائداعظم کی قانون ساز اسمبلی سے تقریر کے حوالے سے یہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک سیکولر ریاست کا قیام چاہتے تھے جس میں ریاست کسی مذہب کی نمائندہ نہ ہو، وہ کسی شہری سے مذہب کی بنیاد پر تفریق نہ کرتے ہوئے ہر طرح کی مذہبی آزادی کو یقینی بنائے۔ جبکہ دوسرا نقطہ نظر تحریک پاکستان میں مذہب کے کردار اور قائداعظم کی دیگر تقاریر کی بنیاد پر یہ رائے رکھتا ہے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست ہی بنانا چاہتے تھے۔

ہمارے نزدیک اس نزاع کو ماضی کے بجائے حال میں رہ کر حل کرنا چاہیے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان ایک جمہوری عمل کے ذریعے حاصل ہوا۔ کچھ انتہا پسندوں کو چھوڑ تمام سیکولر اور مذہبی عناصر بھی پاکستان کو جمہوری ریاست ہی مانتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کی غالب ترین اکثریت مسلمان ہے۔ وہ اسلام کو اپنا مذہب کہتی ہے۔ اور اسلام کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ ریاست کے معاملے میں خاموش نہیں ہے۔ وہ حکمرانوں کو مذہبی ذمہ داریاں تفویض کرتا ہے اور مذہبی بنیادوں پر بہت سے ایسے احکام دیتا ہے جن کا نفاذ صرف حکمران ہی کر سکتے ہیں۔

چنانچہ یہ طے ہے کہ کوئی مسلم معاشرہ اگر واقعی مسلم ہے تو پھر وہ سیکولر نہیں ہوسکتا۔ تاہم یہ ''اگر'' ایک بہت بڑا اگر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کی اکثریت دین کا شعور رکھتی ہو۔ ایک پرجوش مذہبی اقلیت اگر دباؤ ڈال کر اپنی تعبیر دین کو قانونی سطح پر نافذ بھی کروا دے تو معاشرتی سطح پر اس کے کوئی مثبت اثرات نہیں نکلیں گے۔ بلکہ یہ طرز عمل الٹا اسلام کی بدنامی کا سبب بنے گا۔ بدقسمتی سے ریاست پاکستان یہ سارے مراحل دیکھ چکی ہے۔ اب بعض مذہبی

عناصر دستوری اسلامائزیشن کے اس تجربے کی ناکامی کے بعد بالجبر اقتدار پر قبضہ کرکے اپنا خاص فہم اسلام لوگوں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حل اول تو قابل عمل ہی نہیں اور سوائے دہشت گردی اور فساد کے اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلنا۔ تاہم کبھی یہ خواب شرمندہ تعبیر بھی ہوا تو پھر کچھ ہی عرصے میں معاشرہ نفس مذہب کے خلاف شدید بغاوت کردے گا۔

اس وقت اہل مذہب کے لیے بہترین لائحہ عمل یہی ہے کہ وہ اسلام کو ایک دعوت بنا کر پیش کریں۔ مگر اس میں بھی مسئلہ یہ ہے کہ دہشت گردی کے اِن برسوں میں اہل مذہب کی اخلاقی حیثیت بری طرح مجروح ہوچکی ہے۔ اتنی کمزور اخلاقی پوزیشن کے ساتھ کوئی بھی کام ہوسکتا ہے، دعوت کا کام نہیں ہوسکتا۔ اس اخلاقی حیثیت کو بحال کرنے کا یہی راستہ ہے کہ اہل مذہب دہشت گردی کے ہر شائبے سے اپنی جان چھڑائیں۔ اس کے بغیر سیکولر طبقات ہر گزرتے دن کے ساتھ پاکستان میں اخلاقی طور پر مضبوط ہوتے چلے جائیں گے۔

اپنی اخلاقی پوزیشن کی بحالی کے ساتھ اہل مذہب کو دین کی دعوت وقت کے فکری مسلمہ معیارات کے مطابق پیش کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر جدید معاشروں میں اب ان کی بات نہیں سنی جائے گی۔ فکری مسلمات سے مطابقت کا مطلب دین کے واضح احکام پر سمجھوتہ نہیں ہے۔ مثلاً بیشتر جدید دنیا سزائے موت کے خلاف ہوچکی ہے۔ جبکہ پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ قصاص میں زندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے پروردگار کے فیصلے پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ لیکن بہت سے ایسے معاملات ہیں جن میں جدید سماجیات اسلام کی منشا کو عصری تقاضوں کے مطابق بہتر طریقے پر حاصل کررہی ہے۔ ایسے معاملات میں قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر از سر نو غور وفکر کرنے اور ایک نئے فقہی ڈھانچے کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ ایسے معاملات میں طرز کہن پہ اڑنا اور آئین نو سے ڈرنا پاکستانی ریاست اور سماج کو بتدریج اسلام سے دور کردے گا جو بہت بڑا نقصان ہوگا۔

فرض کفایہ

اہل مذہب پر ایک فریضہ عائد ہو چکا ہے۔ یہ تحریر اس فرض کفایہ کو ادا کرنے کی ایک حقیر کوشش ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خدا کچھ بھی گوارا کر سکتا ہے، یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچایا جائے۔ کوئی داعی ہے تو سر آنکھوں پر۔ وہ اپنا اجر پائے گا۔ اگر خدا بن کر لوگوں کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گا تو مجرم کہلائے گا۔

پاکستان اور دنیا بھر میں پچھلے برسوں میں خون کی جو ہولی کھیلی گئی اور جس میں ساٹھ ہزار سے زائد معصوم پاکستانی اور دنیا بھر میں نجانے کتنے بچے بوڑھے عورتیں اور مرد قتل کر دیے گئے، وہ اسلام کے مقدس نام پر کھیلی جا رہی ہے۔ یہ اسلام کی دعوت کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ کاش اسلام کے نام پر کھڑے لوگ اس حقیقت کو جان لیں۔

کسی نے اگر کوئی نظریاتی ڈھال بنا رکھی ہے تو وہ سن لے! پروردگار عالم کو زبردستی اپنی بندگی کرانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے اپنا دین لوگوں پر ٹھونسنا اور زبردستی مسلط کرنا ہو تو کسی نافرمان کو ایک گھونٹ پانی بھی پینے کو نہیں مل سکتا۔ مگر اس نے یہ دنیا آزادی کے اصول پر بنائی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق اس نے علماء کو انذار کا منصب سونپا ہے۔ ان کا کام سماج کو دعوت دینا اور ان کے سوالوں کے جواب دینا ہے۔ ان کو خدا کی پکڑ سے ڈرانا ہے۔ وہ اگر خود دوسروں کو پکڑنے کی کوشش کریں گے اور دوسروں کے بارے میں فیصلے دینے لگیں گے تو یہ خدائی کا دعویٰ کرنے کے برابر ہوگا۔ یہ بدترین جرم ہے۔

اسلام اللہ پروردگار عالم کا دین ہے۔ وہی پروردگار عالم جس کی پکڑ بہت سخت اور جس کا عذاب ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ وہ اتنا بے خبر نہیں جتنا یار لوگوں نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ اس کی تقویم کا ایک دن، ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا تو لمحہ بھی برسوں پر محیط ہوتا ہے۔ لوگ سن

لیں! مجرموں کی مہلت اب تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔

اسلام کے مقدس نام پر اپنے تعصّبات کی جنگ لڑنے والے سن لیں! بے گناہوں کو قتل کرنے والے، قاتلوں کو اگر اور مگر کی ڈھال فراہم کرنے والے، نکتہ آفرینیاں کر کے مجرموں کا تحفظ کرنے والے جان لیں! وہ صرف انسان ہی کے نہیں اسلام کی دعوت کے بھی قاتل ہیں۔ختم نبوت کے بعد خدا کچھ بھی گوارا کرسکتا ہے۔ یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچایا جائے۔ جو یہ کرنے کی کوشش کرے گا، پروردگار عالم دنیا میں بھی اسے عبرت کا نشان بنا دے گا اور آخرت میں بھی ختم نہ ہونے والے عذاب سے دوچار کرے گا۔

توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ جو لوٹے گا وہ اپنے آقا کو غفور و رحیم پائے گا۔مگر جو سرکشی پر آمادہ رہے گا اسے یہودیوں کے انجام کو یاد رکھنا چاہیے۔ہم سب کو بھی یاد رہنا چاہیے کہ جو مسلمان خاموش رہتے ہیں، انھیں آخر کار بخت نصر، ٹائٹس رومی، چنگیز خان اور ہلاکو خان کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔اپنی جان کے خوف سے غیر جانبدار رہنے والے جان لیں، خدا کی جنگ میں کوئی غیر جانبداری نہیں ہوتی۔ وہ بھی پکڑ کی زد میں آئیں گے۔اور جب آئیں گے تو ان کے بچے ذبح کر دیے جائیں گے اور ان کی عورتوں کی عصمت سر بازار لوٹی جائے گی۔خاموش رہنے والو! اُس روز خدا کے نام کی دہائی مت دینا! آج جواب دو تو بچا لیے جاؤ گے۔خاموش رہو گے تو اُس روز تمھاری چیخیں آسمان کی بلندی تک جا پہنچیں گی، مگر آسمان سے کوئی جواب نہ آئے گا۔اٹھو کہ ابھی وقت ہے۔ جاگو کہ ابھی بھی موقع ہے۔

اسلام دعوت ہے۔ یہ ہدایت ہے۔ یہ رحمت ہے۔اس کے والی رحمت للعالمین تھے۔وہ داروغہ نہیں تھے۔سزا اور جزا دینا خدا کا حق ہے۔ وہ ایک دن سزا و جزا برپا کر کے رہے گا۔یہی ان کا پیغام تھا۔انھی کی پیروی میں دنیا کی فلاح ہے۔انھی کی پیروی میں آخرت کی نجات ہے۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

کیا جنت پہلے سے موجود ہے؟

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر آپ نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ میں نے آپ کی تین تصانیف پڑھی ہیں اور الحمد للہ بہت فائدہ ہوا ہے۔ سر میرے کچھ اشکال ہیں اگر آپ دور فرما دیں گے تو بہت شکر گزار ہوں گا۔

آپ کی تصنیف میں آپ نے ذکر فرمایا کہ قیامت کے بعد اسی دنیا کو جنت کی شکل دے دی جائے گی۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جنت پہلے سے وجود میں نہیں آ چکی کیونکہ سورہ یس میں اس تیسرے شخص کے بارے میں کہ جس نے دو نبیوں کی حمایت کا اعلان کیا جنت میں جانے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس پر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ'' کاش میری قوم کو معلوم ہوتا'' ۔ میرا مقصد ہرگز آپ پر تنقید یا دل شکنی کرنا نہیں ہے۔ میں بس اس میں تھوڑا کنفیوز ہوں۔ اگر آپ اس چیز کی وضاحت فرما دیں تو بہت مشکور ہوں گا۔ آپ کی تصانیف کے بعد اب میں نے الحمد للہ قرآن کو بھی ترجمہ کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ ثابت قدمی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔، جواد احمد نسیم

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیز من ای میل کا شکریہ۔ آپ اطمینان سے تنقید کریں، سوال کریں میں اس کا ہرگز برا نہیں مانتا، تنقید کرنا یا سوال کرنا غلط نہیں۔ جو چیز غلط ہوتی ہے وہ الزام، بہتان، بغیر سمجھے اور سوال

کیے خود کو عالم و فاضل سمجھ کر دوسرے کے متعلق فیصلہ دے دینا ہے۔ میں جو کچھ بیان کرتا ہوں، میری آراء ہوتی ہیں۔ یہ غلط بھی ہوسکتی ہیں۔ دوسروں کو حق ہے کہ مجھ سے اختلاف کریں۔ یہی حق مجھے حاصل ہے کہ میں اگر دلیل رکھتا ہوں تو ان سے اختلاف کروں۔

جو سوال آپ نے اٹھایا ہے اس میں اہل علم کی ایک سے زیادہ آرا ہیں۔ یعنی جنت بن چکی ہے یا قیامت کے بعد بنے گی۔ میں ان اہل علم کی رائے کو درست سمجھتا ہوں جن کے نزدیک جنت قیامت کے بعد بنائی جائے گی۔ میں پہلے کیے جانے والے ایک سوال کے جواب میں اپنے وہ دلائل بیان کر چکا ہوں جن کی بنا پر میرا رجحان اس طرف ہے کہ جنت قیامت کے بعد بنائی جائے گی۔ یہ اب میری کتاب ''تیسری روشنی'' کا حصہ ہے۔

سورہ یسین کی جس آیت کا حوالہ آپ نے دیا ہے اس میں بشارت کے موقع کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں اس رائے کو درست سمجھتا ہوں جو اسے دخول جنت کے بجائے بشارت جنت کہتی ہے۔ اسلاف میں سے مجاہد تابعی کی رائے یہ ہے کہ یہ بات ان کی شہادت کے وقت ملائکہ نے بطور بشارت ان سے کہی اور جنت میں وہ قیامت کے دن ہی داخل ہوں گے۔

یہی بات ایک دوسرے انداز میں صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے اس طرح لکھی ہے۔

''مذکورہ اعلان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی پوری قوم ان کی دشمن بن کر ان کے خلاف سازشوں میں لگ گئی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم کے شر سے محفوظ رکھا اور حمایت حق کی راہ میں انھوں نے یہ بازی جو کھیلی اس کے صلہ میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی جس پر انھوں نے اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش میری قوم بھی اس بات کی قدر و قیمت جانتی جس کے صلہ میں مجھے یہ

مغفرت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ بشارت ان کو کس موقع پر دی گئی ہے۔ کلام کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے تین امکان سامنے آتے ہیں: ایک یہ کہ ان کے اس اعلان کے بعد قوم کے اشرار نے ان کو شہید کر دیا اور اس وقت ان کو یہ بشارت دی گئی ہو۔ دوسرا یہ کہ اس کے بعد انھوں نے قوم کے رویہ سے مایوس ہو کر ہجرت فرمائی ہو اور اس وقت ان کو یہ بشارت ملی ہو۔ تیسرا یہ کہ اس کے بعد چونکہ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ان کو وفات دی ہو۔ ان میں سے پہلا امکان کلام کے سیاق وسباق کی روشنی میں اگرچہ زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے لیکن سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر ہم نے ان کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم کی سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ ان کے وداعی کلمات کے بعد ان کی حفاظت کا ذکر یوں ہوا ہے۔ ''(اے میری قوم کے لوگو!) میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اس کو تم عنقریب یاد کرو گے میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو دیکھنے والا ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان سازشوں کی آفات سے محفوظ رکھا جو لوگوں نے اس کے خلاف کیں اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ (آیت 44-45)''۔ اس آیت کی روشنی میں یہ امکان تو خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ ان کو قتل کیا گیا البتہ مذکورہ بالا دو امکان باقی رہ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دو میں سے کون سی صورت پیش آئی۔ اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ بس اتنی بات یقینی ہے کہ حق کی حمایت میں جو جانبازی انھوں نے دکھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انعام ان کو یہ ملا کہ اسی دنیا میں مبشر بالجنۃ قرار پائے۔''

\-----------------

وجاہت مسعود

دیبل کا قلعہ اور نمل یونیورسٹی

ملتان اور راجن پور سے کچھ نوجوان گزشتہ ہفتے لاہور آئے۔ بہت سے اصحاب علم نے ثقیل موضوعات پر گفتگو کی۔ درویش نے ایک سادہ طریقہ اختیار کیا۔ آٹھ رضا کار چن لیے اور انہیں دعوت دی کہ سارک میں شامل ملکوں کی فہرست تیار کر دیں۔ اس آؤٹ آف کورس سوال پر خاصی ہڑ بڑاہٹ پھیلی۔ بالآخر ہاتھ میں پکڑے موبائل سے مدد لے کر اور طویل باہم مشاورت کے بعد آٹھ ملکوں کے نام چارٹ پر نمودار ہو گئے۔ عرض کیا کہ اب ان ملکوں کی آبادی بھی لکھ دیں۔ ان خواتین و حضرات میں سے سات افراد ایم اے اور ایک بی ایس آنرز تھا۔ بھوٹان کی آبادی چار کروڑ اور سری لنکا کی آبادی آٹھ سے دس کروڑ بتائی گئی۔ معلوم ہوا کہ جغرافیہ وغیرہ تو 'سخن فہمی عالم بالا' کا مضمون ہے البتہ یہ خواتین و حضرات سیاست پر بات کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ راولپنڈی سازش کیس کا انکشاف کس برس میں ہوا تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکات کس برس پیش کیے تھے۔ جواب نہیں مل سکا۔ نتیجہ یہ نکالا گیا کہ جس ملک میں روزانہ دو سو سے زائد کالم لکھے جاتے ہیں اور ٹیلی وژن پر درجنوں ٹاک شوز پیش کیے جاتے ہیں وہاں تجزیے کے تین بنیادی زاویوں سے ہم قریب قریب ناآشنا ہیں۔ ہم اعداد و شمار کی صحت کو زیادہ وزن نہیں دیتے۔ ملی جذبے کی آنچ پر تجزیے کی ہانڈی چڑھا دیتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں سے دو سو ارب ڈالر کی رقم واپس لانا چاہتے ہیں۔ ایک نہایت کرپٹ شخص کے بارے میں ایک دن اعلان کرتے ہیں کہ وہ ہر روز دو ارب روپے رشوت لیتا تھا۔ پھر پتہ لگتا ہے کہ نہیں یہ رقم دو کروڑ روپے تھی۔ ہماری تجزیاتی صلاحیت کا دوسرا روشن پہلو یہ ہے کہ ہم تقویم کی ترتیب میں غیر محتاط ہی نہیں، بے خبر بھی ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انقلاب فرانس پہلے واقع ہوا تھا یا

انقلاب ایران۔ تیسرے یہ کہ ہم مختلف واقعات میں مکانی ترتیب یعنی جغرافیائی فاصلے سے بھی قطعی بے نیاز ہیں۔ ہمارے خیال میں درہ خیبر سے رکشہ لیں تو آدھے گھنٹے میں دیبل کے قلعے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ان حالات میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم علت و معلول کی جو کڑیاں تیار کرتے ہیں وہ ہمارے گلے کا طوق اور پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ ہم ایک خیراتی اسپتال کو صحت کے شعبے میں ترقی کا نسخہ سمجھتے ہیں اور اس نکتے پر بالکل غور نہیں کرتے کہ علاج معالجے پر تحقیق کا شعبہ ہمارے ہاں کس حالت میں ہے اور کیا ہم ایسی تحقیق کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ پھر ایک دن خبر آتی ہے کہ فلاں دولت مند شخص نے ایک یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ یہ ایسے ہنر مند صاحب سرمایہ ہیں کہ موقع محل کی مناسبت سے یونیورسٹی اور مسجد کی تعمیر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ٹیکس بہرحال نہیں دیتے۔ ہم انصاف کے نام پر پارلیمنٹ کے درپے ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کے نام پر قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر تفرقہ پھیلاتے ہیں۔قومی مفاد کے نام پر ریاست کی لٹیا ڈبوتے ہیں۔ وفاق کے نام پر صوبوں کو روندتے ہیں اور صوبائی حقوق کا نام لے کر مقامی قانون شکنی کرتے ہیں۔ عام طور سے درویش تنقید کرنے کی بجائے امید کے پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ تاہم کبھی کبھی حقیقت پر بھی آنکھ رکھنی چاہیے۔ دنیا کو بہتر بنانے کے لیے دنیا کو سمجھنا بہت ضروری ہے اور اس میں دوسروں کو بدلنا اتنا اہم نہیں جتنا اس امر پہ غور کرنا کہ ہمارے اندر کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ یہیں پر پانی مرتا ہے۔ ہمارا جہادی ہو یا نوجوان تعلیم یافتہ عبقری، ہمیں دنیا کو بدلنے کی بہت فکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاید ہم آج کی دنیا کو پورے طور سے سمجھتے بھی نہیں اور سمجھنا محض اعداد و شمار سے واقفیت کا نام نہیں۔ یہ محض مشین چلانے کا ہنر بھی نہیں۔ سمجھنے کا تقاضا تو یہ جاننا ہے کہ کسی شعبے میں اب تک کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ گزشتہ کل میں کیا صورت حال تھی۔ کون سے نئے عوامل تصویر کا حصہ بنے ہیں اور اگر معاملہ اسی طرح آگے

بڑھتا ہے تو کل کی تصویر کیا ہوگی اور اگر ہم آنے والے کل کو اپنے لیے مفید خدوخال دینا چاہتے ہیں تو ہمیں کن عوامل میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ کیا ہمیں محض دوسروں کی بنائی ہوئی ٹیکنالوجی خریدنا ہے یا ٹیکنالوجی کی پیداوار میں شریک ہونا ہے۔ ہمیں دوسروں کی لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ کرنا ہے یا خود بھی ایک کتاب لکھنا ہے۔ ہمیں دوسروں کی تحقیق سے فائدہ اٹھانا ہے یا تحقیق کے عمل میں شریک ہونا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم 'خدائی فوجدار' اور 'مامور من اللہ' ہونے کا وہم ختم کر دیں۔ جنگ کی بجائے امن کا خواب دیکھیں۔ انقلاب کی بجائے استحکام کی صورتوں پر توجہ دیں۔ 'کیا ہونا چاہیے' کا نتیجہ نکالنے سے پہلے یہ معلوم کر لیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔

بشکریہ روزنامہ جنگ

پروفیسر محمد عقیل

ایک تھے پاپا۔۔۔۔

ایک دن میں اپنی چار سالہ بیٹی علینہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے کہا بیٹا کہانی سناؤ۔ وہ کہنے لگی:

''ایک تھے پاپا، وہ مر گئے۔ کہانی ختم پیسہ ہضم۔''

میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ پھر میں نے اس سے کہا بیٹا یہ بات اپنی ماما کو نہ بتانا ورنہ وہ تمہاری پٹائی لگا دیں گی۔ پھر میں سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی میری کہانی تو بس یہی ہے جو میری بیٹی نے بیان کی۔ ایک تھے پاپا اور وہ مر گئے کہانی ختم پیسہ ہضم۔ مجھے یوں لگا یہ پیغام اللہ نے چار سالہ علینہ کے ذریعے دلوا دیا ہو۔

موت اکثر لوگوں کے نزدیک ایک ایسی بات ہے جس کا ذکر بھی وہ گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ موت ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ یہ ایک نئی صبح کا پیغام ہے۔ یہ اس ابدی زندگی کی ابتدا ہے جسے کبھی ختم نہیں ہونا، جسے کوئی موت نہیں آنی۔ موت وہ دروازہ ہے جو غیب کی جانب کھلتا ہے۔ یہ وہ زینہ ہے جس پر چڑھے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں، یہ وہ کھڑکی ہے جس سے فرشتوں کا نظارہ ممکن ہے۔

وہ کیسا منظر ہوگا جب ہم قبر سے اٹھائے جائیں گے۔ افراتفری، ابتری، بے چینی بے بسی۔ لیکن اگر ہم ان لوگوں میں شامل ہوں جو بے حساب جنت میں داخل ہونگے تو پھر حشر کی سختیاں ہمارے لیے نہ ہوں گی۔ پھر تو ہم حشر میں ایک ناظر کے طور پر موجود ہوں گے۔ کتنا حسین ہوگا وہ منظر جب پروردگار کا تخت فرشتے اٹھائے حاضر ہوں گے، رب کی حضوری ہوگی، اس کی شفقت و رحمت کا جلوہ ہوگا۔

اگر ہم السابقون میں ہوئے تو رسولوں کی معیت ہوگی، جنت کے گھر میں اپنی بادشاہت ہوگی۔ ادھر ہم نے سوچا ادھر وہ چیز حاضر۔ کبھی جی چاہا تو موسم ہی بدل دیا، کبھی جی چاہا تو آسمانوں سے دور ایک دنیا آباد کرلی۔ کبھی جی چاہا تو ماضی کے خیالوں میں جا کر خود کو دیکھا، کبھی سوچا تو پھولوں کی وادی میں کھو گئے۔ کبھی خود کو دیکھا تو ریشم اور اطلس کا لباس، ہاتھوں میں سونے کے کنگن، سر پر یاقوت کا تاج، انگلیوں میں زمرد کی انگوٹھی۔

کبھی جی چاہا کہ دیکھیں تو اپنے گمراہ دوستوں کا حال۔ تو جہنم میں جھانکیں گے۔ ہولنا کی عروج پر ہوگی۔ آہیں، سسکیاں، چیخیں، دھاڑیں، رونا، بلبلانا۔ ہر طرف خون اور گوشت کے لوتھڑے، زخموں کے چیرے، کٹی ہوئی ناکیں، پھوٹی ہوئی آنکھیں، پھٹے ہوئے سر۔ کھانے میں پیپ اور زخموں کا دھوون۔

جب گھبرا کے جنت کو دیکھیں گے تو فرشتے کھڑے ہونگے۔ وہ سلام قولا من الرب الرحیم کہہ رہے ہوں گے۔ رب سے ملیں گے، اس کے قدموں میں سر رکھیں گے اور رکھے رہیں گے۔ اب ہم کچھ نہ کہیں گے کہ کہنے کو کچھ باقی ہی نہ رہا، کرنے کو کچھ باقی نہ رہا۔

لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم سب کی کہانی ختم نہ ہو بلکہ درست طریقے سے ختم ہو۔ کاش کہانی کا انجام یوں ہو۔

ایک تھے پاپا، وہ خدا کی رضا پر مر گئے۔ پھر زندگی شروع اور امتحان ختم۔

بے وقوف آدمی کا اصل المیہ یہ ہے کہ اس کی کوئی حماقت آخری نہیں ہوتی (ابویحییٰ)

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

پاکستانی جمہوریت کے مسائل

پاکستان اور جمہوریت

پچھلے مہینے ہم نے آمریت، خلافت اور جمہوریت کے حوالے سے اپنا تفصیلی نقطہ نظر دلائل کے ساتھ بیان کیا تھا۔اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ریاست کا انتظام کون چلائے گا، اس سوال کے جواب میں انسانیت نے اپنی پوری تاریخ میں تین ہی تصورات پیش کیے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بادشاہ اوراس کی اولاد یہ حق رکھتے ہیں کہ ان کا خاندان نسل درنسل معاشرے پر حکومت کرے۔ دوسرا یہ کہ کوئی فرد یا گروہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر یا کسی سازش کے ذریعے سے اقتدار پر قبضہ کرلے اور اپنے مخصوص تصورات اور نظریات کی بنیاد پر حکومت چلاتا رہے۔تیسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی مرضی سے اپنے حکمران کا انتخاب کریں۔

ایک چوتھا طریقہ بھی اُس گفتگو میں زیر بحث آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی ہستی کے بارے میں یہ فیصلہ کردیں کہ وہی حکمران بنے گا اور لوگ اللہ کے اس فیصلے کے مطابق اسے اپنا حکمران بنالیں۔ یہ بہترین راستہ تھا لیکن ختم نبوت کے بعد چونکہ اب اس طریقے سے کسی شخص کے حق میں آسمان کی سند اترنا ممکن نہیں رہی ہے، اس لیے یہ کوئی ممکنہ راستہ نہیں رہا۔

اس کے علاوہ بیان کیے گئے تین طریقوں میں سے دو یعنی بادشاہت اور آمریت ہر پہلو سے ظلم و استبداد کا راستہ کھولتے ہیں۔کوئی بادشاہ یا آمر تو اچھا ہوسکتا ہے، مگر اس نظام میں کوئی خوبی نہیں کیونکہ یہ جبر اور استبداد پر مبنی ہے۔ انسانیت کے سماجی ارتقا سے قبل یہ برائی اسی طرح قابل قبول رہی جس طرح انفرادی سطح پر غلامی انسانی معاشروں کا حصہ تھی۔مگر جیسے جیسے انسانی سماج

ارتقا پذیر ہو رہے ہیں، ان میں جبر و استبداد پر مبنی کوئی نظام قابل عمل نہیں رہا۔ جہاں یہ نظام ابھی تک موجود ہے وہ بھی جلد یا بدیر ختم ہو جائیں گے۔

جمہوری نظام کی کمزوریاں

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ جمہوریت کے نام جو کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے وہ ہر پہلو سے قابل تائید ہے۔ ہم نے سابقہ مضمون میں بھی لکھا تھا کہ ہمارے ہاں تو جمہوریت کے نام پر وہی مذاق ہو رہا ہے جو اسلام کے نام پر فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا زہر پلا کر ہمارے ساتھ کیا گیا تھا۔ لیکن جس طرح ہم اسلام کو اس بنیاد پر نہیں چھوڑ سکتے کہ عملی طور پر اس کے نام پر فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا چلن عام ہے، اسی طرح ہم عوامی رائے کے بجائے جبر و استبداد پر مبنی کسی ایسے نظام کی تائید صرف اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ جمہوری نظام بدترین حالت میں ہے یا یہ کہ اس استبدادی نظام کو خلافت اور اسلام کے مقدس ناموں کی بنیاد پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو ہم نے ماہ فروری کے کالم میں تفصیل سے واضح کر دیا تھا کہ اسلام میں کسی جبر اور استبداد کی کوئی گنجائش نہیں۔

رہے پاکستان کے معروضی حالات تو حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری عمل کے ذریعے سے وجود میں آیا۔ اگر جمہوری اصول نہ ہوتا اور لوگوں کو اپنی مرضی سے سیاسی نظام اختیار کرنے کی آزادی نہ ہوتی تو پاکستان نام کی کوئی ریاست دنیا کے نقشے پر اس وقت موجود نہ ہوتی۔ چنانچہ اس حوالے سے ہمارے ہاں ایک اجماع پایا جاتا ہے کہ اس ملک میں کسی بادشاہت یا کسی آمریت کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے ہاں جو فوجی حکمران بھی آیا اس نے جلد از جلد جمہوری طریقے سے جواز حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کبھی یہ استدلال نہیں کیا کہ حکمرانی میرا حق ہے یا آمریت کا کوئی اخلاقی یا قانون جواز ہے۔ ایک آمر کا اخلاقی جواز ہمیشہ

جمہوری حکمرانوں کا غیر اخلاقی رویہ رہا ہے۔اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

بدقسمتی سے حکمرانوں کا غیر جمہوری اور غیر اخلاقی رویہ ہی آج بھی جمہوری نظام کو سب سے بڑھ کر نقصان پہنچا رہا ہے۔ یہی پاکستان کی جمہوریت کا کمزور ترین پہلو ہے۔ ہمارے جمہوری حکمران اپنے اخلاقی رویوں میں کسی بہتر جگہ پر کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کرتے ۔ان کا یہی رویہ جاری رہا تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ ملک میں ایک دفعہ پھر آمریت نہ آ جائے۔ ذیل میں ہم اپنے جمہوری نظام کے کچھ ایسے ہی پہلوؤں پر توجہ دلا رہے ہیں جو جمہوریت کے سارے واعظین کے مواعظ کے باوجود ملک میں ایک دفعہ پھر آمریت کا چلن عام کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

دولت پر مبنی جمہوری نظام

پاکستان کے سیاسی نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں دولت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔انتخاب میں حصہ لینا اور انتخابی مہم چلانا کسی طور پر کوئی سیاسی عمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ دولت اور طاقت کی بنیاد پر ایک سیاسی کاروبار میں حصہ لینے کے مترادف ہے۔اس وقت صورتحال یہ ہے کہ بیشتر جماعتوں کی طرف سے وہی لوگ انتخاب میں حصہ لیتے ہیں جو کروڑوں روپے پانی کی طرح بہانے کی سکت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جب منتخب ہو جاتے ہیں تو ایوان کی کارروائی میں حصہ لینا، ملک کے نظم و نسق کو بہتر کرنا،عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے بنانے سے کہیں زیادہ ان کی دلچسپی اپنی انویسٹمنٹ کو زیادہ سے زیادہ منافع کے ساتھ وصول کرنے میں ہوتی ہے۔

ایسے میں ملک کے اصل باشندوں یعنی غریب اور مڈل کلاس لوگوں کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ انتخابات میں حصہ لے سکیں۔کسی فرد کی سیرت، شخصیت، صلاحیت، خدمات، سمجھ بوجھ اس

پورے عمل میں شاذ ہی زیر بحث آتی ہیں۔ پیسہ اس راہ کی بنیادی شرط ہے جس کے پاس یہ ہوتا وہی سیاسی جماعتوں سے الیکشن کا ٹکٹ لے پاتا ہے۔ ثانوی طور پر اگر کوئی چیز زیر بحث آتی ہے تو وہ ذات برادری اور قومی اور لسانی تعصّبات ہیں جو زر پر مبنی سیاست میں تعصّبات کا زہر گھولنے کے سوا کوئی اور خدمت سرانجام نہیں دیتے۔

خاندانی سیاسی پارٹیاں

انسانوں میں شاہ پرستی کے جذبات بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ تک دنیا بادشاہی نظام کو قبول کیے رہی جس میں بادشاہ کے بعد بادشاہ کا بیٹا حکمران بنتا تھا۔ تاہم انسانیت نے رفتہ رفتہ اس مرض سے نجات پائی۔ خود ہمارے پڑوس میں بھارت میں عرصہ تک نہرو خاندان اور کانگریس لازم وملزوم رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ وہاں صورتحال بدلی۔ پہلے کانگریس کے علاوہ ایک دوسری پارٹی نے اپنے قدم جمائے۔ جس کے بعد کانگریس میں بھی یہ تبدیلی آئی کہ کانگریس کی حکومت میں بھی نہرو خاندان سے باہر اقتدار منتقل کیا گیا۔

بدقسمتی سے پاکستان میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہوچکی ہے۔ یہاں ابتدا میں خاندانی پارٹیاں کم تھیں۔ مگر اب صورتحال یہ ہوچکی ہے کہ ایک دو جماعتوں کو چھوڑ کر کوئی ایسی قومی یا علاقائی پارٹی نہیں ہے جو باپ کے بعد بیٹے یا بیٹی کے اصول پر نہیں چل رہی ہو۔ اس معاملے میں خرابی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کسی پارٹی میں تن تنہا سارے اختیارات کا مرکز ایک ہی شخصیت بن جاتی ہے۔ جس کے بعد پارٹی تو برائے نام رہتی ہے، اصل وہی شخصیت ساری قوت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ پھر یہ لیڈر شعوری کوشش کرتے ہیں کہ اپنی موجودگی ہی میں اپنی اولاد کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کریں۔ چنانچہ ان کے بعد ان کی اولاد ہی پارٹی کے سربراہ کا منصب سنبھال لیتی ہے۔ اولاد چھوٹی یا نااہل ہو تو بیوی، شوہر، بھائی غرض کوئی بھی قریبی رشتہ ان

کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ گویا ہر پہلو سے خاندانی بادشاہت کا ایک تسلسل ہے جو جمہوریت کے نام پر ہمارے ہاں رائج ہے۔

چنانچہ ایک طرف ایک ہی شخص کے ہاتھ میں سارے اختیارات ہونا اور پھر اس کی طرف سے یہ شعوری فیصلہ کیا جانا کہ اس کے بعد طاقت اس ہی کے خاندان میں رہے، اس خرابی کو بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔

کرپشن اور بیڈ گورننس

زر پر مبنی سیاست اور خاندانی سیاسی پارٹیوں کا لازمی نتیجہ کرپشن اور بیڈ گورننس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارا ملک اگر گردن تک کرپشن کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے اور ایک عشرے کے مسلسل جمہوری عمل کے باوجود بھی اگر ملک مسائل کے گرداب سے نکل نہیں پا رہا تو اس کی وجہ کرپشن اور بیڈ گورننس ہیں۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ دنیا بھر میں کرپشن ہوتی ہے۔ انسان جب تک انسان ہے کرپشن مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکتی۔ یہ بھی بجا کہ ہمیں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنھم جیسی شخصیات کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ مگر کرپشن کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ خاص کر صوبہ سندھ کے حوالے سے جو کچھ سامنے آتا رہتا ہے سچی بات یہ ہے کہ اس کے لیے کرپشن کا لفظ موزوں نہیں ہے۔ اس کے لیے اہل لغت کو کچھ دوسرے الفاظ ایجاد کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارے الزام ہیں۔ کسی خاص جماعت کو بدنام کرنے کی کوشش ہے۔ جمہوریت کے خلاف ایک سازش ہے۔ چلیے یہ ساری باتیں درست سہی، مگر اس صوبے کا جو حشر حکمران جماعت کے ہاتھوں پچھلے آٹھ برسوں میں ہوا ہے وہ اپنی داستان آپ سناتا ہے۔ چھوٹے شہروں اور گوٹھوں کو تو چھوڑ دیجیے کہ ان بے چاروں کی کوئی شنوائی نہیں، شہر کراچی تو نعمت

اللہ خاں صاحب اور مصطفیٰ کمال صاحب جیسے لوگوں کی سربراہی میں 2002 سے 2007 تک بالکل بدل چکا تھا۔ مگر سر دست اس شہر کے لیے درست ترین تعبیر ایک کچرا کنڈی کے سوا کچھ نہیں۔ شہر میں پانی کا کال ہے۔ زیر زمین پانی کثرت استعمال کی وجہ سے بہت نیچے جا چکا ہے۔ شہر میں ہر جگہ گندگی کے ڈھیر ہیں۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ترقیاتی کام نہ ہونے کے برابر ہیں۔

سب سے بڑی چیز امن امان تھی۔ جب تک آپریشن شروع نہیں ہوا تھا دسیوں ہزار لوگ قتل ہو چکے تھے۔ ہر روز تیس چالیس لوگوں کا مارے جانا معمول تھا۔ اسٹریٹ کرائم اپنی انتہا کو چھو رہے تھے۔ مگر پھر نواز شریف صاحب اور جنرل راحیل صاحب نے ایک عزم کیا۔ اس کے نتیجے میں آج صورتحال بہت بہتر ہے، مگر آج یہ آپریشن ختم ہو جائے تو ایک دفعہ پھر کراچی جہنم بن جائے گا۔ ایسے میں جمہوریت کا کوئی وعظ کم از کم اس صوبے اور اس شہر کے باسیوں کو تو اچھا نہیں لگ سکتا۔ لوگ تو آج بھی جنرل مشرف کے تعاون سے نعمت اللہ خان اور مصطفیٰ کمال کے دور کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی بلا سے جمہوریت جاتی ہے تو جائے۔ اگر جمہوری حکمرانوں کا رویہ یہی رہا تو صوبہ سندھ کے حکمران باقی سیاستدانوں کو بھی لے ڈوبیں گے۔

رہا باقی ملک تو گرچہ صوبہ سندھ سے وہاں کے حالات بہت بہتر ہیں، مگر جتنے بہتر ہو سکتے تھے اور ہونے چاہیے تھے، اس کے کوئی آثار نہیں۔ پاکستان میں جتنے وسائل ہیں، عوام پر ٹیکسوں کی جتنی بھرمار ہے، پچھلے ایک عشرے سے جس طرح جمہوریت کو تسلسل حاصل اور خاص کر صوبہ پنجاب میں ایک ہی پارٹی طویل عرصے سے حکمران رہی ہے، اس کے بعد ان کی پرفارمنس بہت بہتر ہونی چاہیے تھی۔ مگر دعا دینی چاہیے پیپلز پارٹی کو کہ جس کی انتہا درجے کی نااہلی کی بنا پر صوبہ پنجاب ہی لوگوں کو آئیڈیل نظر آتا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ توانائی کے بحران اور دہشت گردی میں الجھی ہوئی قوم کے لیے زندگی

کی بنیادی سہولیات یعنی صحت، تعلیم، پٹواری اور پولیس نظام کی خرابیوں سے پاک ایک فلاحی معاشرے کی منزل جو دنیا بھر میں جمہوری معاشروں کا نصب العین ہے، یہاں سرے سے زیر بحث ہی نہیں۔تیل کی بین الاقوامی قیمتوں میں غیر معمولی کمی کے باجود اس کا مکمل فائدہ عوام کو نہیں پہنچا۔حال یہ ہے کہ اس وقت حکمرانوں نے ملک وقوم کو بہت زیادہ شرح سود پر لیے گئے قرضوں کے جال میں بری طرح جکڑ دیا ہے۔ماہرین معیشت کے مطابق یہی صورتحال رہی تو دو چار برسوں میں ملک ڈیفالٹ ہونے کے خطرے سے دوچار ہو جائے گا۔جبکہ حکمرانوں کا واحد انحصار گوادر کی بندرگاہ کے بننے اور وہاں سے متوقع طور پر حاصل ہونے والے ٹیکسوں پر ہے۔یہ ہو گیا تو ملک معاشی تباہی سے بچ جائے گا ورنہ حکمرانوں نے کسی ایسی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی بنا پر ملک میں کسی بہتری کے آثار پیدا ہو جائیں۔یہ نتیجہ ہے خاندانی سیاست دانوں کے اقتدار میں آنے کا۔

صوبائیت اور دہشت گردی کی سپورٹ

پاکستان کے سیاسی نظام کی ایک اور بڑی خامی یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کی اکثریت صوبائیت کی اسیر اور پس پردہ دہشت گردوں کی کسی نہ کسی پہلو سے معاونت کرتی ہے۔صوبہ سندھ میں ہزاروں کی تعداد میں جو لوگ مارے گئے ان کی اکثریت کا تعلق مذہبی دہشت گردی سے نہیں تھا۔یہ دراصل سیاسی جماعتوں کے گینگسٹرز اور ٹارگٹ کلرز کی مہربانی تھی۔یہ کسی اور کے نہیں سپریم کورٹ کے تاثرات ہیں۔

جبکہ ملک کے سب سے بڑے صوبے اور پورے ملک کی حکمران جماعت کے بارے میں یہ تاثر پوری طرح موجود ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف پوری طرح موثر کردار ادا نہیں کر رہی۔ اس کے وزراء کی کالعدم تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ تصویریں گردش کرتی ہیں۔کالعدم

تنظیموں کے نمائندے ان کے ساجھے دار سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ایک نوعیت کی غیر علانیہ چارج شیٹ ہیں جو کبھی بھی باقاعدہ چارج شیٹ کی شکل اختیار کرسکتی ہیں۔

صوبائیت کا حال یہ ہے کہ بیشتر سیاسی جماعتیں اب قومی اساس نہیں رکھیتیں۔ پیپلز پارٹی اندورن سندھ، ایم کیو ایم شہری سندھ، ن لیگ پنجاب کی نمائندہ سمجھی جاتی ہیں۔ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان تو پہلے ہی علاقائی پارٹیوں کے گڑھ رہے ہیں۔ اٹھارہویں ترمیم جس کا بڑا شہرہ ہے، وہ دراصل صوبوں تک محدود ہوتی ان جماعتوں کی ایک حکمت عملی تھی کہ اپنے اپنے علاقے میں ہم حکمران ہوں گے اور ہمیں کرپشن کے لیے کھلے اختیارات اور پیسہ مل جائے گا۔ یہ سب اٹھارہویں ترمیم نے صوبوں کو دے دیا۔ عوام کے حصے میں تو کچھ نہیں آیا۔

عوام سے ان کی ہمدردی کا حال یہ ہے کہ عوام کی فلاح کے بنیادی ادارے یعنی بلدیاتی اداروں کا اول تو برسہا برس انتخاب ہی نہیں ہونے دیا گیا۔ جب سپریم کورٹ نے مجبور کردیا تو جیسے تیسے یہ انتخاب کرا تو دیے مگر کوئی اختیار انھیں دینے کے لیے یہ تیار نہیں۔ یہی ایک بات اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کو عوام کا مفاد عزیز ہے یا اپنے مفادات۔

جمہوری نظام میں بہتری کی تجاویز

ظاہر ہے کہ صرف پاکستان کے جمہوری نظام کی خامیوں کا مرثیہ پڑھنا کارلا حاصل ہے۔ ہمارے پیش نظر اصل چیز ان اصلاحات کی طرف توجہ دلانی ہے جو آنے والے برسوں میں عوام کی آواز بن جانی چاہییں۔ یہ اصلاحات ہوگئیں تو بتدریج حالات بہتر ہوجائیں گے۔ نہ ہوئیں تو پھر حالات بہت خراب ہوں گے۔ سیاستدانوں کا بھی بیڑہ غرق ہوگا، مگر عوام کو بھی بہت تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ باشعور طبقات چند چیزوں کو بنیاد بنا کر عوام کی ذہن سازی کریں کہ آنے والے برسوں میں ملک میں یہ اصلاحالات لازماً ہونی چاہییں۔

جمہوریت اور احتساب

پہلی چیز اس ملک میں یہ طے ہونا چاہیے کہ جمہوریت صرف انتخاب کرانے کا نام نہیں۔ بلکہ اس بات کا بھی نام ہے کہ حکمران قانون سے بلند نہیں ہوتے۔ یہ تصور بادشاہت اور آمریت میں ہوتا ہے کہ حکمران قانون سے بلند ہیں۔ چنانچہ حکمرانوں کے احتساب کے لیے دوسروں سے کہیں زیادہ سخت نظام بننا چاہیے۔

اس مطالبے پر سیاستدان دو عذر پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارا احتساب عوام کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارا ہی احتساب کیوں؟ ججوں اور جرنیلوں کا احتساب بھی ہونا چاہیے۔ یہ دونوں مغالطے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام سیاستدانوں کی کارکردگی کا احتساب کرتے ہیں۔ لیکن سیاستدان کی کرپشن اور جرائم کے احتساب کے لیے ایک موثر عدالتی اور قانونی نظام ضروری ہے۔ یہ عوام کا کام نہیں کہ کرپشن اور جرائم کا احتساب کریں۔ رہا دوسرا مطالبہ تو بے شک ججوں اور جرنیلوں کا احتساب ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ کام تو سیاستدانوں کے کرنے کا ہے۔ اور وہ یہ کام اسی وقت کر سکتے ہیں جب خود کرپشن سے پاک ہوں۔ چنانچہ اس وقت تو اس عذر کو پیش کرنا اپنی نااہلی پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہے۔

چنانچہ ضروری ہے کہ سیاستدانوں کے احتساب کو سب سے مقدم ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو رہنمائی کے لیے خود پیش کرتے ہیں۔ اس احتساب کے لیے موجودہ نیب جیسے حکومتی ادارے موثر نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے پاکستان کے مروجہ حالات میں فوج اور ججوں پر مشتمل ایک نئے نظام کو متعارف کرانا ضروری ہے۔ فوج اور عدلیہ کی مشترکہ طاقت کے بغیر پاکستانی سیاستدان کبھی احتساب کے دائرے میں نہیں آئیں گے۔ اس احتساب کے بغیر ان کے اربوں کھربوں میں بدلتے رہیں گے، ملک قرضوں اور مہنگائی کے بوجھ تلے دبتا رہے گا اور غریب سسک سسک کر مرتے رہیں گے۔

شفاف انتخابات

یہ تو ممکن نہیں کہ انتخابات سے پیسہ نکل جائے۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ ٹیکنالوجی کی مدد سے انتخابات کو اتنا شفاف بنا دیا جائے کہ ہر ووٹر کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کا ووٹ موثر ہوگا۔ کوئی ٹھپہ فیکٹری، کوئی جعلی ووٹ الیکشن کا نتیجہ نہ بدل سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب بائیومیٹرک ووٹنگ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو دور کرنے کا قابل عمل راستہ یہ ہے کہ انتخابی عمل ایک دن کے بجائے آٹھ دس مراحل پر پھیلا دیا جائے۔ جیسا کہ دنیا کے بہت سے مما لک میں ہوتا ہے۔ مگر اس کے بغیر نا اہل لوگوں سے جان چھڑانا ممکن نہیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ انتخابات کے اخراجات کی ایک حقیقت پسندانہ سطح طے کی جائے۔ پھر جیتنے والے شخص کے اخراجات کا آڈٹ کیا جائے۔ اس نے جو اخراجات ظاہر کیے ہیں اگر اس سے زیادہ خرچہ ہے تو پھر نتیجہ کالعدم قرار دے دیا جائے۔

نئے صوبوں کی تشکیل

آنے والے برسوں میں اگر پاکستان کو اپنا وجود برقرار رکھنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ چار صوبوں کے ''مقدس'' تصور سے جان چھڑائی جائے۔ صوبے لسانی بنیادوں کے بجائے انتظامی بنیادوں پر بنیں۔ چاہیں دس بنیں یا بیس۔ مگر بننے ضرور چاہییں۔

اس کے بغیر صوبائیت اور قوم پرستانہ سوچ سے جان چھڑانا ممکن نہیں ہوگا۔ گوادر پورٹ کوریڈور کے حالیہ معاملے میں جس طرح اختلافات سامنے آئے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اس حوالے سے معاملات کتنے نازک ہیں۔ صوبہ سندھ تو اس حوالے سے ایک آتش فشاں کے دہانے پر ہے۔ یہ آتش فشاں جب پھٹے گا تو بہت خرابی ہوگی۔ اس خرابی سے قبل ہی اصلاح کر لی جائے تو معاملات بہتر ہونے کا بہت امکان ہے۔

جہاں رہیے بندگان خدا کے لیے رحمت بن کر رہیں، باعث زحمت نہ بنیے۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (27)

دلائل نبوت و رسالت: خدائی کلام

دعویٰ نبوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت عرب کے کسی مصلح یا حکیم کی نہیں تھی۔ آپ نے نبوت اور رسالت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ دعویٰ کسی سرداری اور بادشاہی کا دعویٰ کرنے کے مترادف نہیں تھا کہ نصیب نے یاوری کی تو بادشاہت اور نہیں کی تو کم از کم ایک حوصلہ مند انسان تو کہلائیں گے۔ نبوت کا دعویٰ تو گویا عالم کے پروردگار کے نمائندے کے حیثیت سے خود کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے برابر تھا۔ وہ پروردگار جس کے ہاتھ میں کل کائنات کی بادشاہی ہے۔ جو سب کچھ جانتا ہے اور اور جو سب کچھ کرسکتا ہے۔ یہ دعویٰ کرنا بھی اتنے بڑے حوصلے کا کام ہے کہ انسانی تاریخ میں شاذ ہی کبھی کسی کو یہ ہمت ہوئی ہے کہ ایسا کوئی دعویٰ کرسکے۔ کسی نبی کاذب یا نفسیاتی مریض نے یہ دعویٰ کیا بھی تو اس کے حصے میں رسوائی اور ندامت کے سوا کچھ نہیں آیا۔ نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی بھی شخص کو اس کے مخاطبین ایسے امتحانات سے گزارتے ہیں کہ اس کے لیے ان پر پورا اترنا کسی بھی طور ممکن نہیں۔ اس کی ایک مثال ہم پچھلی دلیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کے حوالے سے یہ دے چکے ہیں ایک طرف آپ ایک امی تھے اور ہر قسم کے تحریری علم اور مذہبی روایت سے آپ بالکل دور تھے اور دوسری طرح آپ تمام مذہبی علم، روایات اور واقعات کو اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ گویا ہر واقعے کے ظہور کے وقت آپ وہیں وموجود تھے اور اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کے مخاطبین

آپ سے متعین سوالات کرتے تھے جن کا علم کسی طور آپ کو نہیں تھا اور آپ ان کا تفصیلی جواب دے دیا کرتے تھے۔

تاہم اس سے آگے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ کلام میں دو ایسی چیزیں تھیں جو کبھی کسی انسانی کلام میں ممکن نہیں ہوسکتیں۔ایک یہ کہ آپ کا کلام ہر ارتقا اور تضاد سے پاک تھا اور دوسرا یہ ایسے غیر معمولی دعووں پر مشتمل تھا جن کا پورا ہونا معروضی حالات میں عملی طور پر ناممکن تھا لیکن آپ کے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے یہ سارے دعوے پورے ہو گئے۔ ذیل میں ہم انھی کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

ارتقا اور تضاد سے پاک خدائی کلام

یہ بات ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی زندگی میں علم و مذہب کی روایت سے بالکل دور تھے۔مگر ایک روز آپ نے دعویٰ نبوت کیا اور اس کے ساتھ ایک کلام کو خدائی کلام کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ہم اس کا بھی جائزہ لے چکے ہیں کہ یہ کلام ایک معجزانہ کلام تھا اور یہ بھی کہ یہ کلام ماضی کی پوری مذہبی روایت کا بھرپور احاطہ کرتا تھا۔تاہم اس کلام کا ایک اور پہلو ایسا ہے جو کبھی کسی انسانی کلام میں نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ کہ یہ کلام اول دن ہی سے اپنے آخری کمال پر تھا اور آخری دن تک ہر قسم کے تضاد سے پاک رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو علم و مذہب کی روایت سے واقف ہے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ایک عالم یا مصنف پہلے دن ہی اپنا شاہکار تصنیف نہیں کرسکتا۔ ہر شخص علمی اور فکری ارتقا کے ایک خاص عمل سے گزرتا ہے۔وہ ابتداء میں اپنے اساتذہ سے پڑھنا اور لکھنا سیکھتا ہے۔ وہ درس وتدریس کے عمل سے گزرتا ہے۔ پھر جو کچھ لکھنا پڑھنا اس نے سیکھا ہوتا ہے اس کی بنیاد پر وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔اس مرحلے پر بھی اس کے کلام میں غلطیاں ہوتی ہیں اور وہ

اساتذہ فن سے اصلاح لیتا ہے۔اس کے کلام میں ناپختگی کے آثار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

جیسے جیسے اس کا علم بڑھتا ہے، اس کے کلام میں پختگی آتی چلی جاتی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اس کا کلام خوب سے خوب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک روز اس کے ذہن و قلم سے ایک شاہکار تخلیق ہوتا ہے۔اس کی تصنیف دنیا میں دھوم مچا دیتی ہے۔اس کی غزل ادب کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔اس کے خطبات کا شہرہ چار سو ہو جاتا ہے۔اس کے افسانے، ناول اور ڈرامے فن کا معجزہ قرار پاتے ہیں۔تب وہ شیکسپیئر کہلاتا ہے۔ وہ غالب بن جاتا ہے۔ دنیا اسے خدائے سخن میر تقی میر کے نام سے جانتی ہے۔اس وقت اقبال کی بال جبریل وجود میں آتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقام، یہ مرتبہ، کلام کی یہ عظمت، خیال کی یہ رفعت، زبان پر ایسا عبور، سخن کی ایسی نزاکت ایک دن میں حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بہت ریاض کرنا پڑتا ہے۔اس کی بنیادی شرط ہی یہی ہے کہ انسان کہیں نہ کہیں سے اپنا آغاز ضرور کرے۔کوئی فنی معجزہ پہلے ہی دن عام انسانوں کے ہاں ظاہر نہیں ہوسکتا۔ یہ کام صرف اور صرف ایک نبی کر سکتا ہے۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔آپ نے پہلے دن ہی کلام کا معجزہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ارتقا سے پاک فن کا یہی کمال آپ کے نبی ہونے کا ثبوت ہے۔

بات صرف کلام کے محاسن ہی تک محدود نہیں۔ انسان جن خیالات کو پیش کر رہا ہوتا ہے۔ ان میں بھی ارتقا ہوتا ہے۔ ارتقا سے بڑھ کر ان میں تبدیلی اور تضاد تک رونما ہو جاتا ہے۔کوئی مفکر، کوئی دانشور، کوئی فلسفی، کوئی حکیم اس عمل سے استثنا نہیں رکھتا۔انسان فکر کے گھروندے تراشتا ہے، ان کی پرستش کرتا ہے اور ایک روز انھیں توڑ کر نئی منزل کی طرف نکل جاتا ہے۔خاص کر کسی فکر اور دعوت کا تعلق اگر عملی زندگی سے ہو تو پھر ممکن ہی نہیں کہ فکر اور دعوت بدلتی زندگی کے

بدلتے تقاضوں سے متاثر نہ ہو۔ پھر تو رائے بدلتی ہے۔ انسان سابقہ رائے سے رجوع کر کے ایک برعکس رائے قائم کرتا ہی ہے۔ یہی قائداعظم تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی۔ یہی علامہ اقبال تھے۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جیسا ترانہ تخلیق کرنے والے۔ مگر پھر قائداعظم مسلمانوں کے لیے الگ وطن بنانے والے بانی پاکستان بن گئے اور اقبال ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے پر مجبور ہو گئے۔

مگر سرکار دو عالم کا معاملہ یہ تھا کہ آپ مشرکین مکہ کے درمیان کھڑے ہو کر جس توحید و آخرت کی طرف بلاتے ہیں، آخری دن تک اس دعوت میں کوئی تبدیلی کوئی اضافہ اور کوئی ترمیم نہیں ہوتی۔ لوگ ہزار کوشش کرتے ہیں کہ اس پیغام میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی جائے وہ کہتے ہیں کہ کوئی سمجھوتہ کر لو۔ کچھ تم پیچھے ہٹو کچھ ہم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ مگر تمام تر دباؤ کے باجود کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ قرآن تصدیق کرتا ہے کہ یہ دباؤ اس قدر شدید تھا کہ اللہ تعالیٰ حضور کو اپنے موقف پر قائم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ حضور بحیثیت ایک انسان ان کی باتوں کی طرف کچھ مائل ہو جاتے۔ (بنی اسرائیل 74:17)۔ مگر معاملہ خدا کا تھا۔ اس لیے حضور حالات سے قطعی متاثر نہ ہوئے۔ آپ کے کلام اور پیغام میں کوئی معمولی سی تبدیلی نہ ہو سکی۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ آپ کا کلام تھا ہی نہیں۔ ہوتا تو لازماً خیالات بدلتے۔ ارتقا ہوتا۔ تبدیلی ہوتی اور آپ کے کلام میں تضادات کی ایک دنیا آباد ہوتی۔ ان کا نہ ہونا ہی آپ کی صداقت کا ثبوت ہے۔

اس معاملے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اول تا آخر آپ کے کلام میں آپ کو ایک نبی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے پہلے دن خود کو نبی کہا اور آخری دن تک خود کو نبی کہتے رہے۔ آج کے کسی نبوت کا دعویٰ کرنے والے کی طرح آپ نے پہلے دن خود کو مسیح نہیں کہا اور پھر ترقی کر کے نبوت کے درجے پر نہیں پہنچے۔ کسی ظلی اور بروزی نبی کی بحث نہیں چھیڑی۔ کسی سابقہ نبی کا پیرو

ہونے کا دعویٰ کرنے کے بعد ایک روز اپنی نبوت کا دعویٰ نہیں کر دیا۔ آپ پہلے دن ایک نبی تھے اور آخری دن تک نبی ہی رہے۔ تضاد سے پاک آپ کی یہی حیثیت آپ کے نبی برحق ہونے کا ثبوت ہے۔

کلام الٰہی کا خدائی لہجہ اور خدائی دعوے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو خدائی کلام کے طور پر پیش کیا۔ اس کی زبان، اس کا لہجہ، اس کے الفاظ میں ہر جگہ خدا ذوالجلال گفتگو کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاہم خدا کے لہجے میں بولنا کوئی آسان کام نہیں۔ کوئی شخص یہ کوشش کر بھی لے، مگر خدا کا لہجہ بنا کر بولنے سے کچھ نہیں ہوتا، خدا کہیں ہے تو اسے خدا والے کام کرنے بھی پڑتے ہیں۔ خدائی کے دعوے تو کیے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ دعوے نبھائے نہیں جا سکتے۔ تاہم قرآن مجید میں نہ صرف خدائی لہجہ اور خدائی دعوے ہر جگہ موجود ہیں بلکہ مسلمہ تاریخ اس کی مکمل تصدیق کرتی ہے کہ یہ تمام تر دعوے پورے ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ آپ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو حالات آخری درجے میں آپ کے خلاف تھے۔ آپ بادشاہ تھے نہ سردار۔ مذہبی پیشوا نہ فوجی لیڈر۔ تن تنہا آپ نے دعوت دی تو اکا دکا لوگ ایمان لائے۔ جتنے لوگ ایمان لائے اس سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر مخالفت اور مزاحمت شروع ہو گئی۔ یہ مخالفت زبانی ہی نہیں تھی بلکہ عملی سطح پر آپ کے پیروکاروں کو بدترین تشدد اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں قرآن مجید یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وقت کے یہ فرعون یہ سرداران قریش شکست کھا کر بھاگیں گے۔ اس سرزمین مکہ سے ان کے قدم اکھاڑ دیے جائیں گے۔ قرآن کریم اس دعویٰ کے ثبوت میں سابقہ رسولوں کی داستانیں سناتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، قوم ابراہیم، آل فرعون، قوم شعیب اور ان کے جیسی اور بہت سی اقوام نے بھی یہی

سرکشی دکھائی۔ مگر آخرکار خدا کا عذاب آیا اور منکرین رسالت دنیا ہی میں ختم کر دیے گئے۔ قرآن مجید صاف صاف قریش مکہ کو تنبیہہ کرتا ہے کہ بہت جلد ان کے ساتھ بھی یہی ہونے جا رہا ہے۔ اس پر ہم نے بہت تفصیل سے آخرت کے دلائل میں رسولوں کی اقوام کی سزا و جزا کے عنوان سے بحث کی ہے۔

یہاں جس چیز کو نمایاں کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ یہ سارے خدائی دعوے تھے۔ کوئی انسان اس طرح کے دعوے اتنی قطعیت کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ مگر قرآن مجید نے دعوے بھی کیے اور صریح ترین پیش گوئیاں بھی کیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قرآن مجید کی ہر ہر پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ قرآن نے کہا کہ کفار کی جمعیت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ جنگ بدر کے موقع پر انھوں نے شکست کھائی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ہمارے نبی کو مکہ سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو یہ اس سرزمین خود نہیں رہنے پائیں گے۔ چند برس میں ٹھیک ایسا ہی ہوا۔ کفار کا نام و نشان عرب سے مٹ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تم کو خیر کثیر دے دی اور تمھارے دشمن کی جڑ کاٹ دی۔ آخرکار حرم کی خیر کثیر حضور کو مل گئی اور ابوجہل اور ابولہب کی جڑ کاٹ دی گئی۔

یہی خدائی لہجہ ہمیں مدینے میں نظر آتا ہے۔ قرآن یہود سے کہتا ہے کہ تم نے اس نبی کو نہیں مانا تو اب تم بھی مغلوبیت کا مزہ چکھو گے۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ سرزمین عرب میں وہ مغلوب ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید مدینہ میں مشرکین و یہود سے نبرد آزما مسلمانوں کو یقین دلاتا ہے کہ تم کو زمین میں اقتدار دے دیا جائے گا۔ کچھ ہی عرصے میں اقتدار دے دیا جاتا ہے۔ قرآن یہ فیصلہ دیتا ہے کہ اللہ نے رسول کو بھیجا ہی اسی لیے ہے کہ سرزمین عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دے۔ آپ کی وفات سے قبل یہ واقعہ بھی رونما ہو جاتا ہے۔

یہ ہے خدائی لہجہ اور یہ ہیں خدا کے دعوے۔ کوئی انسان یہ دعوے کیسے کرسکتا ہے۔ وہ کربھی لے تو وہ ان دعووں کو پورا کیسے کرسکتا ہے۔ اس کے بعد کیا چیز ہے جس پر لوگ ایمان لائیں گے؟

قرآنی بیانات

''(اے نبی! یہود میں سے) ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب ہو گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔'' (اٰل عمران 12:3)

''وہ تمہیں تھوڑی سی زبان درازی کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد بھی نہیں ہوگی۔'' (اٰل عمران 111:3)

''اور بے شک یہ اس سرزمین سے تمہارے قدم اکھاڑ دینے کے درپے ہیں تاکہ یہ تم کو یہاں سے نکال چھوڑیں۔ اور اگر ایسا ہوا تو تمہارے بعد یہ بھی ٹکنے نہ پائیں گے۔ ہم نے تم سے پہلے اپنے جو رسول بھیجے ان کے باب میں ہماری سنت کو یاد رکھو اور تم ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔'' (بنی اسرائیل 17:77-76)

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو قوت میں تمہاری اس بستی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں جس نے تم کو نکالا ہے۔ ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا پس کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ بن سکا''

(محمد 13:47)

''اور دعا کرو کہ اے میرے رب مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور مجھے نکال عزت کا نکالنا اور مجھے خاص اپنے پاس سے مددگار قوت نصیب کر۔ اور اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے'' (بنی اسرائیل 17:81-80)

''اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔''

(بنی اسرائیل 74:17)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو بخشا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں

ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔'' (النور 55:24)

''پس ان کے اعمال کے برے نتائج ان کے سامنے آئے اور اِن لوگوں میں سے بھی، جنھوں نے شرک کیا ہے، ان کے سامنے ان کے اعمال کے برے نتائج جلد آ کے رہیں گے۔ اور یہ ہم کو ہرانے والے نہیں بن سکتے۔'' (زمر 51:39)

''اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم پاؤ گے۔ پس یہ اس نے تم کو فوری طور پر دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ یہ موجب طمانیت اور مسلمانوں کے لیے نشانی ہو اور تمھیں سیدھی راہ کی ہدایت بخشے۔ اور ایک دوسری فتح بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو لیکن اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (فتح 20-21:48)

''کیا تمہاری قوم کے کفار ان قوموں کے کفار سے کچھ بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں برأت نامہ لکھا ہوا ہے! کیا اِن کا زعم ہے کہ ہم مقابلہ کی قوت رکھنے والی جمعیت ہیں! یاد رکھیں کہ ان کی جمعیت عنقریب شکست کھائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''

(قمر 43-45:54)

''پس تم بھی عنقریب دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ فتنہ میں پڑا ہوا تم میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ انہیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یاب ہیں۔ پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔'' (القلم 5-9:68)

جنت کا حقیقی مستحق وہ ہے جو
قربانی کے درجے میں اس کا طلبگار بنے
آج کا مسلمان تو
خواہش کے درجے میں بھی اس کا طلبگار نہیں (ابویحییٰ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (30)

ہمارے ہاں توہین رسالت کے قانون کا جس قدر غلط استعمال کیا گیا ہے، اس کے نتیجے میں ناموس رسالت کی پاسبانی کا فریضہ تو ہم کیا سرانجام دیتے، ہم نے غیر مسلموں میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کے خلاف نفرت کا بیج اپنے ہاتھوں سے بویا ہے۔ اس غلط استعمال کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ ذاتی جھگڑوں میں لوگ توہین رسالت کا غلط الزام لگا کر مخالف کو سزا دلوانے پر تل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے دین قسم کے لوگ اس قانون ہی کو ہدف بنا لیتے ہیں۔

توہین رسالت، بدکاری کے مقابلے میں ایک بہت ہی بڑا جرم ہے۔ اگر کوئی کسی پر بدکاری کا غلط الزام عائد کرے تو اس کی سزا اسی کوڑے ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بدکاری سے کئی گنا بڑے جرم کا الزام عائد کرنے پر ہمارے ہاں کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اگر قانون کے اس غلط استعمال کو روکنے کی بات کی جائے تو مذہبی لوگ اپنی سیاسی دوکانداری چمکانے کے لئے میدان میں آ جاتے ہیں۔ افسوس کہ ان کا سارا کاروبار ہی نفرت کی بنیاد پر چلتا ہے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس معاملے میں ایک انتہا تو یہ ہے اور دوسری انتہا وہ ہے جس کی بدولت بے دین قسم کے لوگ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی شان میں گستاخی کرتے پھرتے ہیں۔ اس تبصرے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ توہین رسالت کے قانون کو ختم کیا جائے۔ اللہ کے کسی پیغمبر کے ساتھ کوئی شخص اگر گستاخی کا معاملہ کرے تو کسی بھی صاحب ایمان کی غیرت اسے گوارہ نہیں کر سکتی۔ اس قانون کو یقیناً برقرار رہنا چاہیے اور حکومت کے ذریعے اسے پوری قوت سے نافذ کیا جانا چاہیے

تاکہ کسی کو ایسی جسارت کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ مگر اس بات کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ کوئی بددیانت انتہا پسند اس قانون کا غلط استعمال کرتے ہوئے کسی بے گناہ کو سزا نہ دلوا سکے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلامی قوانین بدنام نہ ہوں۔

سامسن کا بازار

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم بازار میں نکلے جو کہ ہوٹل کے گرد و نواح میں واقع تھا۔ یہ بازار پتلی پتلی گلیوں پر مشتمل تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان گلیوں میں بھی بسیں چل رہی تھیں۔ یہاں گوشت کی کچھ دکانیں تھیں اور ان میں ذبح شدہ بکروں کو شورومز میں کچھ اس طریقے سے ڈسپلے کیا گیا تھا جیسے یہ کوئی جدید فیشن کے ملبوسات ہوں۔ یہاں ایک عجیب چیز نظر آئی۔ قیمے کے سینگ نما لمبے لمبے رول گچھوں کی صورت میں شورومز میں لٹکائے گئے تھے۔ اسے غالباً کسی خاص ڈش میں استعمال کیا جاتا ہوگا۔

ایک دکان سے پھل خرید کر ہم گاڑی میں آ بیٹھے اور شہر سے باہر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک صاحب سے ترابزن جانے والی سڑک کا پوچھا۔ انہوں نے ترکی زبان میں نجانے کیا تقریر شروع کر دی۔ خلاصہ یہ تھا کہ ساحل یولو پر چلے جایئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں بھی ساحل کو ساحل ہی کہا جاتا ہے۔ اب ہم پرانے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ گاڑی روکی تو ہر طرف پرانے مکانات تھے۔ ایک مکان کی بالکونی میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جن کی عمر 80 سال کے لگ بھگ ہو گی۔ قریب ہی ان کی ہم عمر شریک حیات صفائی کر رہی تھیں اور پان کھانے کے انداز میں منہ چلا رہی تھیں۔ دونوں کے چہروں پر ایک دوسرے کے لئے محبت کے تاثرات تھے۔ کاش ایسا رومانس ہمارے ہر جوڑے کو نصیب ہو تو زندگی کتنی آسان ہو جائے۔

بلیک سی کا پہلا نظارہ

مختلف سڑکوں سے گھومتے ہوئے ہم بالآخر ساحل یولو پر آ پہنچے۔ اب ہماری نظروں کے سامنے بلیک سی تھا جو واقعتاً سیاہ نظر آ رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا یہ رنگ بس یہیں تک محدود ہے۔ آگے جا کر اس کا پانی نیلا ہی ہو جاتا ہے۔ یہاں بحری جہازوں کا ایک میوزیم بنا ہوا تھا جس میں متروک بحری جہازوں کو سجا سنوار کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ سامسن سے متعلق بروشرز میں یہاں مصطفیٰ کمال کی ذاتیات سے متعلق ایک میوزیم کا ذکر بھی تھا جس میں ہمیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہم شہر سے باہر نکلتے گئے۔ اب ہم ترابزن کے بورڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے ساحل یولو پر سفر کر رہے تھے۔ ہمارے دائیں جانب سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ تھے اور بائیں جانب سمندر۔ یہ نظارہ ہمارے لئے نیا تھا کہ سمندر اور اتنا ڈھیر سا سبزہ ایک جگہ اکٹھا ہو۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

سنو! کہ آج زندہ ہے

سنو! کہ آج زندہ ہے
جو کل گزرا تھا وہ لمحہ تو ماضی کا فسانہ ہے
جو آنے والا موسم ہے اسے بھی بیت جانا ہے
مگر جو آج کا رشتہ ہے کل سے وہ پرانا ہے
کہ ہم تو آج میں جیتے ہیں، مرتے ہیں
اسی میں سانس لیتے ہیں
یہی تو آج اپنا ہے
وہی حسنِ عمل اچھا ہے جو ہم آج کرتے ہیں
جو اچھا آج ہوتا ہے اسے کل یاد کرتے ہیں
وگرنہ بے ثمر لمحے فقط برباد کرتے ہیں

آج خدا کے نام پر
ہر چیز کی طرف بلایا جا رہا ہے
سوائے اس چیز کے
جس کی طرف خود رب نے بلایا ہے
(ابو یحییٰ)

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

ایمان اور ہجرت کے تقاضے

''اے پیغمبر! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ
اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی،
اور چوری نہ کریں گی،
اور زنا کاری نہ کریں گی،
اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی،
اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے درمیان کوئی بہتان نہ تراشیں گی،
اور کسی نیک کام میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی
تو آپ ان سے بیعت کرلیا کریں، اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں
بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔''، (سورہ ممتحنہ 60۔آیت 12)

حدیث:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال کا دارومدار صرف نیت پر ہے اور آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔ (مثلاً) جس نے اللہ اور رسول کے لیے ہجرت کی ہوگی، واقعی اس کی ہجرت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگی۔ اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت دنیا کے لیے یا عورت کے لیے ہی شمار ہوگی۔ (متفق علیہ)